قسط نمبر ۲

نو اعتزال کے بعض پہلو

دیطیف خالد ~~~~~~~~~~~~~ ترجمہ **شیخ نذیر حسین**

احمد امین کی ذات میں جدید اعتزال مصر میں نقطۂ عروج کو پہنچ گیا تھا لیکن وہ اعتزال کے پُرجوش ترجمان بن کر جو کہتے ہیں[۴۲] ہندوستان کے مسلم مصلحین بھی وہی کہتے چلے آئے تھے شائد اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ پہلے ایک مضمون میں "ہمارے ہندوستانی بھائیوں" کو زبردست خراجِ تحسین ادا کر چکے تھے جنہوں نے قدیم اسلامی علوم میں جدید مغربی سائنس کو سمونے کا طریقہ اختیار کیا تھا (اُن کے خیال میں) سر سیّد احمد خان، سیّد امیر علی اور سر محمد اقبال نہ صرف جدید و قدیم علوم ہسلم ثقافت اور یورپی تہذیب کے درمیان سنگھم کی حیثیت رکھتے تھے بلکہ وہ ان علوم کے سلسلے کی گم شدہ کڑیاں تھیں[۴۳]۔ چونکہ یہ اکابر قدیم اور جدید علوم میں مہارت تامہ رکھتے تھے اس لئے احمد امین ان کی کوششوں کو سراہتے ہیں۔ انہیں اعتراف ہے کہ انھوں نے مصریوں کے لئے ایک نیک مثال قائم کر دی ہے۔ اپنے مذکورہ بالا مضمون کے بعد وہ ہر موقع پر ان کے خیالات کی اشاعت میں لگے رہتے ہیں۔ اس تاثر کے نشانات نہ صرف ان کے سلسلۂ تاریخ اسلام بلکہ اُن مقالات میں بھی ملتے ہیں جو وہ الرسالہ اور الثقافتہ جیسے بلند پایہ علمی رسائل میں لکھا کرتے تھے۔ اب یہ مقالات کتابی صورت میں "فیض الخاطر" کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ وہ اقبال کے ڈاکٹریٹ کے مقالہ "ایران میں مابعد الطبیعات کا نشوونما" اور سیّد امیر علی کی سپرٹ آف اسلام کا فجر الاسلام میں اور مسٹر خدا بخش کے انگریزی مضامین اور شاہ ولی اللہ کی حجتہ اللہ البالغہ کا ظہر الاسلام میں حوالہ دیتے ہیں۔ (ظہر الاسلام جلد ثانی ص ۸۳)۔ آخر میں اقبال کی الٰہیات اسلامیہ

کی تشکیل جدید کا عربی ترجمہ اُن کی انجمن، لجنۃ التالیف والترجمہ والنشر نے شائع کیا[۴۴] و[۴۵]۔ گولڈ سیہر کی طرح احمد امین بھی اُردو سے ناآشنا تھے اس لئے وہ نئے معتزلیوں کی مذہبی جماعت کے افکار سے بے خبر رہے جس کی نمائندگی مولانا شبلی نعمانی اور دوسرے اصحاب کرتے تھے۔ احمد امین نے جدید اعتزال کی ثقافتی تحریک کی حیثیت سے جو پُرجوش وکالت کی اس کا منبع معلومات سیّد امیر علی کی تصانیف ہیں۔ سرسیّد احمد خان اور ان کے نائب مولوی چراغ علی تو صرف معتزلی خیالات کی اشاعت میں لگے رہتے تھے جبکہ سیّد امیر علی اپنے علم کے مطابق اعتزال کو اس کے تاریخی پس منظر کے ساتھ بیان کرتے تھے۔ اعتزال کے بانی واصل بن عطا کے بارے میں سید امیر علی لکھتے ہیں۔

" دو صدیوں تک معتزلی مکتبِ فکر مسلمانوں کے ذہنوں پر حکمراں رہا اور روشن خیال خلفاء کی حمایت و تائید سے اس نے مسلمانوں کی قومی اور عملی زندگی میں جان دی جس کا مشاہدہ اس سے قبل نہ ہوا تھا۔

معتزلی خیالات تیزی سے اسلامی سلطنت کے پڑھے لکھے لوگوں میں پھیل گئے۔ اس کے بعد ان خیالات نے اندلس پہنچ کر وہاں کے مدارس و مکاتب پر اپنا قبضہ جما لیا۔ منصور اور اس کے جانشین عقلیت پسندی کی ہمت افزائی کیا کرتے تھے لیکن معتزلی عقائد سے وابستگی کا کھلم کھلا اظہار بھی نہیں کرتے تھے۔

مامون الرشید جو بجا طور پر ایشیا کا خلیفۂ اعظم کہلانے کا مستحق ہے، فخر سے خود کو معتزلی افکار کا حلقہ بگوش کہا کرتا تھا۔ اس کے لڑکوں معتصم اور واثق نے سارے عالم میں عقلی روح پھونکنے کی کوشش کی۔ ان کے دورِ حکومت میں عقلیت کو وہ عروج حاصل ہوا جو ابھی تک موجودہ یورپی ممالک کو بھی حاصل نہیں ہوا۔"[۴۸]

قدیم خیالات کے مبلغین تو سیّد امیر علی کے بیان کردہ تاریخی پس منظر کو پڑھ کر کانپ اٹھیں گے جبکہ وہ خلیفہ متوکل کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں :۔

" متوکل شرابی، ظالم اور عقل باختہ تھا۔ اس کے دماغ میں سودا سمایا کہ وہ معتزلہ کے مخالفین سے اتحاد کر کے نفع میں رہے گا اور عوام میں مقبولیت حاصل کر کے پُرجوش مذہبی دیوانوں کے لئے

مثالی خلیفہ بن جائے گا۔ اس نے فرمان جاری کیا کہ ترقی کے دعوے داروں کو سرکاری دفاتر سے نکال دیا جائے (اس کے بعد) دارالعلوم بند کر دیئے گئے، ادب، سائنس اور فلسفۂ شجرہ ممنوعہ قرار دیئے گئے اور عقلیت پسندوں کو بغداد سے مار کر بھگا دیا گیا۔ اس نے حضرت علیؓ اور اُن کے صاحبزادگان کے مقابر منہدم کرا دیئے۔ اب متعصب فقہاء، اسلام کے ترجمان اور حکومت کے معاملات پر قابض تھے"[۴۹]

گولڈسیہر کا یہ کہنا صحیح ہے کہ سید امیر علی نے اعتزال کی جو مدح سرائی کی ہے وہ کسی حد تک مبالغہ آمیز ہے۔ احمد امین کا کمال یہ ہے کہ وہ مذکورہ بالا بیان کی صداقت کو تسلیم کرتے ہوئے سارے مبحث کو تاریخی حقائق کی روشنی میں پرکھتے ہیں۔ ان کے علم و فضل کے بلند معیار کے معترف نہ صرف مسلم دانشور ہیں بلکہ مستشرقین بھی ان کی مدح و توصیف میں رطب اللّسان نظر آتے ہیں[۵۱] اس کے علاوہ احمد امین نے کبھی بھی اس بات پر زور نہیں دیا کہ اسلام بنیادی طور پر عربی قسم کا ہے جو بقول گولڈسیہر جدید مصر کی اصلاحی تحریک کا امتیازی نشان رہا ہے۔ ان کے فکر و نظر کی وسعت کا بہترین اندازہ مشہور مصری اُدیب، مؤرخ ڈاکٹر طٰہ حسین نے فجر الاسلام کے مقدمہ میں اس طرح لگایا ہے۔ "مجھے معلوم نہیں کہ عربی ادب کا کوئی مؤرخ ڈاکٹر احمد امین کی طرح عربوں اور ہندوستانیوں یا عربوں اور ایرانیوں میں ثقافتی رشتہ استوار کرنے میں کامیاب رہا ہو"[۵۲] اُن کی اس روش کا یہ نتیجہ نکلا کہ وہ بہ نسبت جامعۂ مصریہ کے دوسرے اساتذہ کے جو عرب قومیت کے نشے میں سرشار تھے، ہندوستانی مسلمانوں کے نئے معتزلیوں کے افکار سے زیادہ متاثر ہوئے۔ احمد امین خلفائے راشدین کے زرّیں عہد کے اسلام کی طرف بازگشت یا اس کے احیاء کی دعوت نہیں دیتے بلکہ ان کے فکر و نظر پر عباسی عہد ہی چھایا رہتا ہے۔ وہ اپنی تاریخی تصانیف میں جب معتزلہ کے عروج کی داستان رقم کرتے ہیں تو ان کا رہوارِ قلم خوب جولانیاں دکھاتا ہے۔ گولڈسیہر کے الفاظ میں: "ان سے پہلے مصری نشاۃ ثانیہ پر وہابی ثقافت کی چھاپ لگی ہوئی تھی"[۵۳] لیکن احمد امین نے اپنا دامن اس سے بچائے رکھا۔

۱۹۱۲ء میں قاہرہ سے استاد جمال الدین قاسمی کی تاریخ الجہمیۃ والمعتزلۃ چھپ کر شائع ہوئی۔ بعد ازاں ۱۹۲۵ء میں کرد علی کی کتاب القدیم والحدیث شائع ہوئی[۵۴] جس میں ایک باب طاہر جزائری کے قلم سے اعتزال پر ہے لیکن احمد امین جیسے ازہری عالم کے لئے فجر الاسلام میں متکلمین کے بارے میں کوئی درجن بھر صفحات لکھ دینا ایک انقلابی اقدام کی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کے بعد

ضحی الاسلام شائع ہوئی۔ اس کی تیسری جلد کے ایک تہائی حصے میں انھوں نے معتزلی افکار سے بحث کی ہے، علم کلام کی عہد بعہد ترقیوں پر روشنی ڈالی ہے، اعتزال کے اصولِ خمسہ کی تشریح کی ہے، معتزلی مفکروں کا تعارف کرایا ہے، اور کلام پاک کے قدیم اور حادث ہونے پر جو فکری نزاع برپا ہوئی تھی اس پر خوب بحث و تمحیص کی ہے۔ صدیوں سے یہ خیالات گڑے مُردے سمجھے جاتے تھے۔ اب ان کی ناقدانہ تحلیل الحاد سے کم نہ تھی۔ اس کے باوجود انھوں نے جن نتائج کا استخراج کیا ہے وہ دوہری حیثیت سے جراءت مندانہ ہیں۔ وہ لکھتے ہیں :-

"مجھے کامل یقین ہے کہ مامون، واثق اور احمد بن ابی دواد اپنی آراء کے اظہار میں مخلص تھے۔ وہ جو کچھ کہتے تھے، اُسی کو سچ جانتے تھے اور میں بھی ان سے متفق ہوں کہ وہ سچ ہی تھا لیکن مجھے اس سے اختلاف ہے کہ تمام لوگوں کو جملہ حقائق سے آگاہ کر دیا جائے۔"[۵۵]

معتزلی افکار کی جو تشریح و تعبیر احمد امین نے کی ہے، اس کے ابتکار پر زور دیتے ہوئے غوبیغ کا سپاغ کا خیال ہے کہ اس میں ایک ادیب کی کردار نگاری کا رنگ بھی پایا جاتا ہے[۵۸] احمد امین نے اعتزال کے سربرآوردہ نمائندوں مثلاً علاف، نظام اور جاحظ کے کردار نیز معتزلی ذہنیت کا جو خاکہ کھینچا ہے، اس میں یہ جھلک صاف طور پر نظر آتی ہے۔ جب سے قدامت پسند علماء نے معتزلیوں پر فتح حاصل کی ہے، آج تک کسی نے ان کے افکار و خیالات کو ایسی تفصیل، غیر جانبداری اور ہمدردی سے بیان نہیں کیا[۵۹] اس کے باوجود معتزلہ کے بارے میں ان کا رویّہ کچھ مبہم سا نظر آتا ہے وہ معتزلہ کی اس لئے تعریف و توصیف کرتے ہیں کہ وہ اسلام کی مدافعت کیا کرتے تھے لیکن وہ دوسری طرف یہ بھی کہتے ہیں کہ انھوں نے اپنی فکری آزادی پر ایک پابندی لگالی تھی اور وہ تھی وحی الٰہی کی قائم کردہ حدود اور وجود باری تعالیٰ کا پیشگی اقرار۔ وہ لکھتے ہیں: "متکلم کا حال وفادار وکیل کا سا ہے، جیسے اپنے مقدمے کی صداقت پر یقین ہوتا ہے اور وہ اُس کے دفاع اور وکالت کے لئے اُٹھ کھڑا ہوتا ہے، دلائل و براہین سے اپنے دعویٰ کو مضبوط کرتا، اور اپنے مزعومات کو صحیح ثابت کرتا ہے۔"[۶۱]

فلسفی کا حال متکلم سے جدا ہے۔ اگر وہ پس منظر اور ماحول کے مؤثرات سے آزاد نہ بھی ہو، تب بھی اُس کی تحقیق کی بنیاد معروضی ہوتی ہے اور وہ اپنے معتقدات سے بے نیاز ہو کر بے باکانہ نتائج کا اعلان کر دیتا ہے اور اس کا حال منصف مزاج جج کا سا ہوتا ہے[۶۲] معتزلہ کے اسی موقف

میں احمد امین کو ایک علمی اور مثالی مسلمان کی جھلک نظر آتی ہے۔ وہ ضحی الاسلام میں لکھتے ہیں:۔

"معتزلہ نے عقلِ مطلق سے کام لے کر تمام مسائل پر بحث کی، ان کا دائرۂ فکر و نظر کسی ایک چیز میں محدود نہ تھا اور نہ وہ فکر و نظر کی تنگ نائے کو ماننے کے لئے تیار تھے۔[۶۳]

اس ربط کو ثابت کرنے کے لئے وہ لکھتے ہیں کہ یہ متکلمین ہی تھے جنہوں نے یونانی فلسفہ کو علومِ اسلامیہ میں داخل کیا لیکن اس کے بعد وہ ان کے درمیان حدِ فاصل کھینچتے ہوئے لکھتے ہیں کہ علمِ کلام کی تاریخ فلسفہ سے جداگانہ ہے۔ علمِ کلام کا نشو و نما خود بخود اسلام میں فقہ اور بلاغت کی طرح ہوا تھا جبکہ فلسفہ یونان سے بنا بنایا حاصل کیا گیا تھا۔ ہم فلسفہ کو اس لئے علومِ اسلامیہ میں داخل نہیں کر سکتے ہیں کہ مسلمان اس کی تشریح و تعبیر کرتے چلے آئے ہیں۔

"ہم علمِ کلام کو اسلامی علوم میں شامل کر سکتے ہیں۔ اگرچہ اس میں یونانی فلسفہ کے بعض عناصر کی آمیزش ہے لیکن اس کے باوجود ہم کندی، فارابی اور ابنِ سینا کی حکمت کو اسلامی نہیں قرار دیتے"[۶۴]

غرضیکہ بنیادی طور پر ان کو فلسفہ میں غیر محدود سائنسی تحقیقات کا نمونہ نظر آتا ہے۔ ایک طرف وہ اس مثالی نمونے کو پیشِ نظر رکھتے ہیں اور اس میں انہیں بیرونی ثقافت کی یک طرفہ ثقافت نظر آتی ہے جو ان کے اصولِ تقلیم و تطعیم[۶۵] (کانٹ چھانٹ اور پیوندکاری) کے منافی ہے۔ اس لئے وہ غیر محدود تحقیقات کے لئے کبھی تو علمِ کلام کو موزوں سمجھتے ہیں اور کبھی فلسفہ کو اس کے مناسب حال بتاتے ہیں۔ اس تناقص کو دُور کرنے کے لئے ہم علمِ کلام کی طرف رجوع کرتے ہیں جس کی راہ سے فلسفہ اسلام میں داخل ہوا تھا لیکن جب وہ وحی الٰہی کی عائد کردہ پابندیوں کا بار بار حوالہ دیتے ہیں تو ان کے بیانات میں کھلا تناقص نظر آتا ہے۔[۶۶]

"حریتِ افکار"[۶۷] کے لئے ضروری ہے کہ اُس پر بیرونی علم کا غلبہ نہ ہو لیکن علوم و فنون کی اس آمیزش میں ضروری ہے کہ مسلمانوں کی انفرادیت قائم رہے اور اس انفرادیت کا تصور اس کے بغیر ممکن نہیں کہ قرآن پاک کلی طور پر اللہ کا کلام ہے۔

ایک جگہ لکھتے ہیں "معتزلہ اپنی بحثوں میں بار بار قرآنی آیات کا حوالہ دیتے ہیں۔ ان کے دلائل کا انحصار قرآن پاک پر تھا نہ کہ یونان کی حکمت پر۔ اصل میں علمِ کلام دونوں کا مجموعہ ہے لیکن فلسفہ کی نسبت علمِ کلام مسلمانوں کی شخصیت کا زیادہ شاندار مظہر ہے۔"

فلاسفہ نے فلسفہ کی تعمیر اعتزال کے کھنڈروں پر کی تھی لیکن ان کو اسلام سے اسی وقت سروکار ہوتا جب وہ مذہب اور فلسفہ میں تطابق و توافق پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں :-

"مسلمان فلاسفہ اسلامی دنیا میں یونانی علوم و فنون کے وفد کی حیثیت رکھتے تھے۔ وہ قومی زندگی کے دھارے سے الگ تھلگ رہ کر زندگی بسر کرتے، ہاں اگر جدل و مناظرہ ہوتا تو وہ ضرور دخل انداز ہوتے۔ ان کے برخلاف معتزلہ اقتدار کے خواہاں تھے، وہ نہ صرف قوم کی صلاح چاہتے تھے بلکہ اس کے رہنما بن کر رہنا چاہتے تھے۔ وہ کسی گوشے میں الگ تھلگ پڑے رہنے پر قانع نہ تھے۔" [۶۹]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اخلاقی وجوہ کی بنا پر احمد امین معتزلہ کو فلاسفہ پر ترجیح دیتے تھے وہ اپنے تئیں مصلح بھی سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ قوم کی اصلاح کے لئے مصلحین کی جماعت کا وجود بھی قوم کے لئے ضروری ہے۔ دوسری جگہ لکھتے ہیں :-

"مجھے اس امر سے اتفاق نہیں کہ فلاسفہ نے معتزلہ کا کام سنبھال لیا تھا۔ درحقیقت فلاسفہ نے محدثین کے دائرۂ اقتدار میں دخل نہیں دیا۔ فلاسفہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے تھے کہ اس نے ان کو محدثین کے اثر سے محفوظ رکھا۔ ان (فلاسفہ) کی یہی آرزو تھی کہ مابعد الطبیعاتی مسائل میں غور و فکر کرنے کے بعد انہیں جو سرور حاصل ہوتا ہے وہ ابدالآباد تک قائم رہے۔" [۷۰]

اس لحاظ سے معتزلہ کی مثال مسلمانوں کو نشاۃ ثانیہ کے لئے رواں دواں رکھتی ہے۔ ضحی الاسلام میں انھوں نے لکھا ہے :-

"مذہبی دار و گیر کے بعد معتزلیوں کا ستارہ اقبال گردش میں آ گیا اور مسلمان ایک ہزار برس تک قدامت پسند علماء کے زیر اقتدار رہے۔ علماء کا اقتدار مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ تک قائم رہا۔ اس نشاۃ ثانیہ میں ہمیں اعتزال کی بعض خصوصیات نظر آتی ہیں۔ اس میں شک بھی ہے اور تجربہ بھی، جس کے نظام اور جاحظ داعی تھے۔ اس بیداری میں عقل کی کارفرمائی ہے، حریت فکر پر اعتماد ہے اور بحث و تمحیص اور تحقیق و تدقیق کا احترام بھی ہے۔ اس کی بدولت انسان میں خودشناسی اور خودنگری پیدا ہوئی ہے جس کے حصول کے لئے معتزلہ ساری عمر لڑتے رہے اور آخر کار فنا ہو گئے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ معتزلی تعلیمات کا سرچشمہ اسلامی تعلیمات تھیں جبکہ موجودہ بیداری کی بنیاد عقل محض پر ہے، اس کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں بلکہ وہ مذہب کی بالادستی سے آزاد ہے۔" [۷۱]

معتزلہ کا انسانی شخصیت کی تعمیر میں بڑا ہاتھ ہے۔ انھوں نے خدا کا نیا تصوّر پیدا کر کے انسان کو اوہام سے نجات دلائی۔ ان کا بلند تصور سادہ مزاج محدثین کے تصوّر سے اعلیٰ تھا جو تجسیم کے قائل تھے اور عقیدہ جبر پر اعتقاد رکھتے تھے۔ ان کا خدا عدل و انصاف کے لئے کسی قید کا پابند نہ تھا۔ اس کی وجہ سے انسان مجبور محض بن کر جنّوں اور ولیوں کی شفاعت ڈھونڈا کرتے تھے[۴۲] جبکہ معتزلہ کو ذاتِ باری تعالیٰ میں محبت و انصاف کی شان نظر آتی تھی۔ اس نئے عقیدے نے مسلمانوں میں تحقیق و تفتیش کی روح پھونک دی۔ محققین کی اس جماعت میں احمد امین، علامہ اقبال رح[۴۳] کے بعد نظام و جاحظ کو صفِ اوّل میں دیکھتے ہیں[۴۴] معتزلہ کے متعلق ان کے فکری افق کا اندازہ المعتزلہ والمحدثون اور الابتکار والتقلید کی متبادل اصطلاحات کے استعمال سے لگایا جا سکتا ہے[۴۵] اعتزال کے احیاء کے بارے میں انھوں نے جو امید باندھی تھی، اس کی صدائے بازگشت ان کی تحریروں میں بھی پائی جاتی ہے۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں :۔

"معتزلہ نے دینی تفکیر کا جذبہ ابھارا اور مسلمانوں میں تحقیق و تجسّس کا شوق پیدا کر کے ان کا رخ ان مسائل کی طرف موڑ دیا جس کی طرف کسی نے بھی توجہ نہ کی تھی۔ انھوں نے علمِ کلام، طبیعات اور سیاسیات میں نئے نئے مسائل پیدا کئے۔"[۴۶]

انھوں نے جس علمی روح کی اہمیت پر زور دیا تھا اس کی تصویر کشی سید امیر علی نے ذیل کے الفاظ میں کی ہے :۔

"ممتاز علماء، مشاہیر اطباء، سربرآوردہ ریاضی دان اور مورّخین، گویا تمام علمی دنیا بشمول خلفاء معتزلی افکار کے حلقہ بگوش تھے"[۴۷]

یقیناً اس فخر و مباہات کے لئے معقول وجوہ ہیں۔ معتزلی پس منظر علمی روح کے لئے مشعلِ راہ ہے جس کے مداح مسلمان ہی نہیں غیر مسلم بھی ہیں۔ پروفیسر روڈی پاریت (RUDI PARET) جنہوں نے حال ہی میں قرآن پاک کا جرمن زبان میں ترجمہ کیا ہے، اپنے ایک مقالہ بعنوان "نظّام ایک تجربہ کرنے والے کی حیثیت سے" معتزلہ کو ان الفاظ میں خراجِ تحسین ادا کرتے ہیں۔

"پہلی ہی نظر میں پتہ چلتا ہے کہ یہ کارنامہ اپنے علمی طریقے کی وجہ سے بڑی اہمیت کا حامل ہے اگر اس کا موازنہ قرونِ وسطیٰ کے حیواناتی لٹریچر کے اقتباسات سے کیا جائے تو ہمارا یہ خیال مبدل بہ یقین

ہو جائے گا۔"

البرتوس مگنوس (ALBERTUS MAGNUS) سے نظام کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"طبعی علوم میں وہ نظریہ ساز ہی نہیں بلکہ اس کی معلومات مبنی بر مشاہدہ ہیں بخلاف اس کے نظّام فطرت کا فلسفی اور دینیاتی مفکر ہے۔"[۷۸]

اسی طرح آئن سٹائن اور ہولبس کے افکار کے مطالعہ کا یہ مطلب نہیں کہ ہم نے کسی مسلم شخصیّت کے افکار سے (ثقافتی) رشتہ توڑ لیا ہے۔ احمد امین نے ضحی الاسلام میں معتزلہ اور محدثین کی امن پسندانہ مسابقت کا ذکر کیا ہے لیکن ایک دوسرے مضمون میں انھوں نے فریقین کے مناقشات کی یک طرفہ تصویر کھینچی ہے۔ ضحی الاسلام کی تالیف سے انہیں جو شہرت حاصل ہوئی تھی اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ فریقین کی خصوصیات کا تذکرہ بڑی خوبی سے کرتے ہیں لیکن یہ مضمون سرسری سا ہے اور اس کا معتذرانہ دفاع کچھ پھیکا سا نظر آتا ہے۔ وہ ثابت کرتے ہیں کہ مغربی (یورپی) سائنس معتزلہ کی ایجاد ہے، اگر معتزلی مکتبِ فکر معدوم نہ ہو جاتا تو مغرب بھی مستعار لباس پہن کر (عملی دنیا میں) شان و شوکت سے جلوہ نمانہ ہوتا اور مسلمان ہی موجودہ دنیا کے معلّم اور سربراہ ہوتے۔[۷۹]

لیکن یہ سطحیت عارضی ہے اور بحیثیت مجموعی ان کے افکار کی نمائندہ نہیں۔ قدرتی بات ہے کہ احمد امین جیسا ماہر تعلیم جو اپنے مشن کے جذبے سے سرشار ہے، اس کو یہ ترقیاتی کارنامے اس کی آرزوؤں کے مقابلے میں غیر اہم نظر آتے ہیں۔ ان میں صبر اور بے قراری کی جو آمیزش ان کے دوستوں کو نظر آتی ہے، وہ ان کی کامیابیوں کی ذمہ دار ہے[۸۰] انھوں نے اسلامی تاریخ پر جو قابلِ ستائش سلسلہ سپردِ قلم کیا ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کو معتزلہ کے علمی کارناموں کی صحیح تصویر دکھائی جا سکے لیکن انھوں نے اسی پر بس نہیں کیا۔ ان کو شدت سے احساس ہو چلا تھا کہ معتزلہ کا انجام دردناک ہوا تھا، اس کا سامنا کرنے کے لئے تاریخ کا غیر جانبدارانہ اور مسلسل بیان ناکافی ہوگا۔ وہ ایک مضمون میں رقم طراز ہیں:

"مغربی تہذیب کے اطوار اپنانے کے بعد مسلمان اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے بجائے اغیار کی نقل و تقلید میں لگے ہوئے ہیں۔ اس سے اُن میں احساسِ کمتری پیدا ہو گیا ہے۔"[۸۱]

طالب علموں کو احساسِ کمتری سے نجات دلانا ایک استاد کے لئے جو مفتی محمد عبدہٗ اور مصطفیٰ عبدالرازق کا ذہنی شاگرد تھا، منفعت بخش کاروبار تھا[۸۲] عباسی عہد کا مثالی نمونہ دور افتادہ تھا۔ اس

دُوری کو کم کرنے کی ضرورت کا احساس کرتے ہوئے انھوں نے اکابر معتزلہ کی بہترین نگارشات کی تجدید کا کام اپنے ذمے لیا۔ اعتزال کے دفاع کو مضبوط کرنے کے لئے انھوں نے شاندار مثال قائم کی یعنی انھوں نے معتزلہ کے ساحر ادیب ابو حیّان توحیدی (متوفی ۴۱۴ھ) کی ان تالیفات کو زندہ کرنے کا ارادہ کیا جنہیں مدّت سے لوگ بھلا چکے تھے۔ احمد امین کے شوق اور اَن تھک محنت کی بدولت ہمیں ابو حیّان توحیدی کی کتاب الامتاع والموانسۃ (۳ جلد ۴۴-۱۹۳۹ء) الھوامل والشوامل (۱۹۵۱ء) اور البصائر والذخائر (۱۹۵۳ء) کے عمدہ ایڈیشن دستیاب ہوئے ہیں۔ الھوامل والشوامل توحیدی اور ابن مسکویہ (متوفی ۴۲۱ھ) کے سوالات وجوابات پر مشتمل ہے اگرچہ اسمیں موخر الذکر کا حصہ طوالت اور فلسفیانہ مباحث ہر دو اعتبار سے زیادہ ہے تاہم اس کو شائع کرتے وقت احمد امین کے ذہن میں توحیدی ہی تھے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ احمد امین زبان، ادب اور فکر کے لحاظ سے توحیدی ہی کو بہترین مصنفوں میں شمار کرتے تھے[۸۳] توحیدی انسانِ کامل کے نظریہ سے بھی مسحور تھا اس لئے وہ تمام مسائل کو انسان دوستی کی نظر سے دیکھتا ہے۔ مسلمانوں کو موجودہ زمانے کی طاقتوں کا سامنا کرنا ہے۔ اور خودی کی پہچان کے اس بحرانی دَور میں اعتزال جیسی بے مثال ثقافتی تحریک کا بہتر نمائندہ توحیدی کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ توحیدی کی نگارشات اس زرّیں عہد کی یادگار ہیں جبکہ اعتزال کا آفتاب اقبال نصف النہار پر تھا۔ اس کے باوجود اس کی تصانیف میں عقائد کا توافق نظر نہیں آتا۔ معتزلہ کا پانچ اصولوں پر اتفاق تھا لیکن ان میں وہ فکری وحدت ویکسانی نظر نہیں آتی جو اُن کے مکتب فکر سے متوقع ہو سکتی ہے۔ دیگر معتزلی اکابر کی طرح توحیدی کی کتابیں جامع علوم الدینیہ نہیں ہیں اسلام کی صداقت کو اختصار کی صورت میں پیش کرنے کا کام معتزلہ کے بعد امام غزالی نے سرانجام دیا۔ ان کے کارنامے کا مقابلہ (عیسائی دنیا میں) تھامس اکوینس (THOMAS AQUINAS) (۱۲۲۵-۱۲۷۴ء) کے عملی نتائج سے اخذ کیا جا سکتا ہے۔ جس طرح امام غزالی نے آخری عمر میں تصوف کو اپنا لیا تھا احمد امین نے بھی بڑھاپے میں ان کی اقتداء کی لیکن اس کے بعد جلد ہی نہ صرف ذاتی حیثیت سے بلکہ مجموعی طور پر جدید اعتزال کو زوال آ گیا۔ اب جو علماءَ البیغ نادرُ یا ابو زہرہ (تاریخ المذاہب الاسلامیہ) کی طرح اعتزال میں تحقیق کرتے ہیں تو اس میں ذاتی لگن کے بجائے محض علمی شوق کار فرما ہوتا ہے۔ جب حریت فکر نے اسلامی ممالک میں مذہبی روایات کی زنجیروں کو توڑ دیا تو اعتزال سے ثقافتی استفادہ کرنے میں

کچھ زیادہ کشش نہیں رہی۔ جن مسلم ممالک میں سیکولر دستور نافذ ہے وہاں اعتزال اپنی افادیت کھو بیٹھا ہے لیکن جہاں سیکولر نظامِ حکومت عوام کو ایک آنکھ نہیں بھاتا اور لوگ اسلامی قانون کے تحت اور صبر آزما لیکن غیر واضح راستے پر چل پڑے ہیں وہاں اعتزال کا فیض جاری رہے گا جب تک کہ عباسی دَور کی تصانیف بے کار نہیں ہو جاتیں یا ان کے بتائے ہوئے حل کے مقابلے میں بہتر حل نہیں پیش کیا جا سکتا۔ اس زمانے کی آمد تک جدید اعتزال کا دَور دَورہ رہے گا اور اس کی وجہ سے شمعِ حریت فروزاں رہے گی۔ اس پہلو کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ہم ایک طرح سے یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ جہاں اعتزال کی اہمیت ہو گی وہاں حریتِ فکر معدوم ہو گی یا اس کی مخالفت ہو گی۔ اس امر کی نشان دہی زہدی جار اللہ نے اپنی کتاب المعتزلہ میں اچھی طرح کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

" یورپ میں اگر کہیں حرکت رجعیہ حرکت فکریہ پر غالب آجاتی (جس طرح اسلام میں حرکت رجعیہ معتزلہ پر غالب آ گئی تھی) تو یورپ کی باعظمت مدنیت جس پر آج ساری دنیا فخر کر رہی ہے اور جس کی علوِ منزلت سے کوئی ناواقف نہیں اور جسے سابقہ مدنیات پر برتری حاصل ہے، عالمِ وجود ہی میں نہ آئی۔" [۸۴]

دوسری جگہ لکھتے ہیں:-

" ہم سنی ہیں اس لئے معتزلہ کے بہت سے اقوال و آراء سے ہمیں اتفاق نہیں ہے، نہ اُن کی فلسفیانہ موشگافیوں اور سوفسطائیت کا پہلو لئے ہوئے نکتہ سنجیوں سے متفق ہیں لیکن ایک ایسی چیز ہے جو ہمیں اپنی طرف کھینچتی ہے، جس کے اعتراف و تحسین میں اپنے تئیں مجبور پاتے ہیں، کھلے دل سے اس کی عظمت کے آگے سر جھکا دیتے ہیں اور جس کی طرف لوگوں کو دعوت دیتے ہیں، وہ چیز ہے معتزلہ کی روح اور ان کا جذبہ۔ وہ روح جسے بلادِ اہلِ سنت سے دیس نکالا ملا اور شیعہ ممالک میں پناہ ملی لیکن اس کے بعد وہ گھٹی گھٹی سی رہی۔ وہ روح جس میں جرأت تھی، جو بے باک تھی، جو فلسفے کی دلدادہ تھی، جو راہِ اعتدال پر شروع میں گامزن رہی، جو تجدید کی متلاشی اور عقل کے مجد و شرف کی علمبردار تھی، جس نے اصولِ وحدانیت کو شائبۂ تجسیم سے پاک کیا۔ یہی روح ہے جس کی ہمیں ضرورت ہے، جس کا زندہ کرنا وقت کی پکار ہے تاکہ ہم میں ایک نئی قوت پیدا ہو جائے، ہم ایک نئے جذبے اور نئی آرزو سے ہم کنار ہو جائیں تاکہ بہت سی ان مشکلات سے عہدہ برآ ہو سکیں

جنہیں عصر جدید نے پیدا کیا ہے"[۸۵]

معتزلہ کی کارکردگی پر احمد امین نے یہ فیصلہ سنایا ہے:

"میری رائے میں معتزلہ کا خاتمہ مسلمانوں کے لئے بہت بڑی مصیبت تھا لیکن یہ مصیبت وہ اپنے ہاتھوں لائے تھے"۔[۸۶]

اقبال نے اپنے ایک لیکچر بعنوان "سپرٹ آف اسلامک کلچر" میں اسی خیال کو دہرایا ہے[۸۷] ان کا یہ بیان ان دیندار مسلمانوں کے اندیشے کا مظہر ہے جو توسط (اعتدال) کا راستہ اختیار کرنا چاہتے ہیں تاکہ مسلمان تنگ نظر مصلحین اور انتہا پسند دنیادار رہنماؤں کے پیچھے لگ کر یک رخی نہ اختیار کرلیں۔

اس کا ذکر پہلے آچکا ہے کہ موجودہ مسلم مصلحین کا مجمع الکمال (خیالات و افکار کے اعتبار سے) دورِ اوّل کے معتزلیوں سے مشابہت رکھتا ہے۔ انھوں نے معتدل خیالات کے مسلمانوں کو یکجا ہونے کی دعوت دی جبکہ وہ ایک طرف سے نیم تعلیم یافتہ ظاہریوں اور دوسری طرف ترقی یافتہ روافض اور قرامطہ کے نرغے میں آچکے تھے۔ اس نظریے کے پیش نظر ہندی مسلمانوں کے روشن خیال طبقے نے معتزلہ کا جو نام استعمال کیا ہے وہ اتنا غیر تاریخی اور گمراہ کن نہیں جتنا کہ مسٹر ڈنکن بی میکڈانلڈ خیال کرتے ہیں لیکن ساتھ ہی ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ نئے معتزلہ اِسم بامسمیٰ تھے۔

(باقی)

حواشی وحوالہ جات

[۴۰] ظہر الاسلام جلد دوم

[۴۱] DIE RICHTUNGEN DER ISLAMISCHEN KORANAUSLEGUNG, P. 323.

[۴۲] کاسپاغ CASPAR.

[۴۳] حلقہ مفقودہ کے عنوان سے فیض الخاطر جلد اوّل ص ۳۳۳۔۳۴۳ میں احمد امین لکھتے ہیں:
اگر آپ اقبال کا مطالعہ کریں تو دیکھیں گے کہ وہ کائنات کے فلسفہ پر اظہارِ خیال کرتے ہیں، تو نہایت گہری بحث کرتے ہیں۔ غزالی کا ذکر کرتے ہیں تو دقت نظر سے اس کے فلسفہ پر نقد و تبصرہ کرتے ہیں۔ اسلام اور نصرانیت کا مقابلہ کرتے ہیں تو ان مذاہب سے گہری واقفیت کا ثبوت دیتے

ہیں۔ المالوئی شاعر گوئٹے کے کلام کی ایسی نقدی و تحلیل کرتے ہیں کہ آدمی حیران رہ جاتا ہے۔ معتزلہ اور ارباب تصوف کا تذکرہ کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان کے افکار اور خیالات کی گہرائیوں میں اتر چکے ہیں اور جس طرح ایک یورپین اپنی قوم کے لذیذ اور میٹھے فلسفہ پر بحث کرتا ہے اسی طرح اقبال بھی ان فرقوں کی تعلیمات پر نہایت تفصیلی اور رسیلی بحث کرتے ہیں۔

سر سید احمد خان اور سید امیر علی کے حالات انھوں نے زعماء الاصلاح میں لکھے ہیں (زعماء الاسلام کا ترجمہ اس مضمون کے مترجم کے قلم سے شائع ہو چکا ہے)

[44] احمد امین لجنۃ التألیف والترجمہ والنشر کے ۱۹۱۴ء سے لے کر ۱۹۵۴ء تک صدر رہے اور الثقافۃ کی بھی ادارت کرتے رہے۔

[45] تجدید التفکیر الدینی فی الاسلام ترجمہ محمود عباس (طبع قاہرہ ۱۹۵۵ء)

[46] رسالہ تہذیب الاخلاق سر سید احمد خان اور مولوی چراغ کے اہتمام سے نکلتا تھا موخر الذکر کی کتاب سلطنت عثمانیہ اور دوسرے مسلم ممالک میں مجوزہ سیاسی، قانونی اور اجتماعی اصلاحات (طبع بمبئی ۱۸۸۳ء) بھی ملاحظہ ہو۔

[47] سپرٹ آف اسلام (۱۸۶۹ء) ص ۶۱۰ - [48] ایضاً ص ۶۲۰ - [49] ایضاً ص ۶۴۶

[50] DIE RICHTUNGEN, 310-17

[51] برگستراسر اور شادے نے احمد امین کو فجر الاسلام اور ضحی الاسلام لکھنے پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری دلوائی تھی۔

[52] ضحی الاسلام ص- ۵ [53] DIE RICHTUNGEN, 321

[54] القدیم والحدیث (قاہرہ ۱۹۲۵ء)

[55] L. GARDET OP. cit, 47

[56] کاسپاغ ص ۱۵۳ و ۱۵۸ [57] ضحی الاسلام جلد ثالث ص ۱۹۴

[58] کاسپاغ حوالہ سابقہ ص ۱۸۲ [59] ایضاً

[60] فیض الخاطر، جلد اوّل ص ۱۵۵ [61] ضحی الاسلام جلد ثالث ص ۱۸

[62] ایضاً ص ۱۸ [63] ایضاً ۶۸

[۶۴] ایضاً ص ۲۰ [۶۵] فیض الخاطر جلد ثالث ص ۱۱۹

[۶۶] ابتکار (فیض الخاطر جلد پنجم ص ۱۵۶) [۶۷] ضحی الاسلام جلد ثالث ص ۱۹۶ و ۲۰۳

[۶۸] فیض الخاطر جلد چہارم ص ۲۸۸

[۶۹] WALTHER BRAUNE, P: 109

[۷۰] ضحی الاسلام جلد ثالث ص ۲۰۵ [۷۱] ایضاً ص ۲۰۷

[۷۲] ایضاً ص ۷-۱۹۱ [۷۳] RECONSTRUCTION, P. 128

[۷۴] فیض الخاطر جلد نہم ص ۱۲ [۷۵] ایضاً جلد نہم ص ۲۰۰

[۷۶] ضحی الاسلام جلد ثالث ص ۹۴ : فیض الخاطر جلد پنجم ص ۱۵۵

[۷۷] ایضاً ص ۶۱۰

[۷۸] DER ISLAM (1928) P. 228-223. [۷۹] فیض الخاطر جلد نہم ص ۲۰۰

[۸۰] احمد امین کلمہ و کلام الاصدقاء (طبع قاہرہ ۱۹۵۵ء)

[۸۱] فیض الخاطر جلد نہم ص ۲۰۱ [۸۲] حیاتی

[۸۳] محمد ارکون عربوں کی انسان دوستی طبع سٹڈیا اسلامیکا نمبر ۱۴ ص ۷۵-۷۴

[۸۴] ایضاً ۲۶۶ [۸۵] ایضاً ۲۶۴

[۸۶] ضحی الاسلام جلد ثالث ص ۲۰۷ [۸۷] RECONSTRUCTION, P. 149.

[۸۸] میکڈانلڈ حوالہ سابقہ ص ۱۹۶

[۸۹] کاسپاغ حوالہ سابقہ ص ۱۴۳